Date of Publication : 09-05-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 10-11 May 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

15-21 May 2014
Issue: 19, Vol.:73

۱۵ تا ۲۱ رمئی ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۱۹، جلد نمبر: ۷۳

یاد ش بخیر میری عمر سات آٹھ سال کی رہی ہوگی کہ ڈاکٹر اعجاز حسین اور ان کے بچوں کے ساتھ میں ایک بجے ہوئے کمرے میں داخل ہوا جس میں چند بزرگ حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ ان میں توانا تندرست کچھ دبلے پتلے، کسی نے نام لیا تو معلوم ہوا کہ ان دبلے پتلے حضرات میں ایک پریم چند جی تھے۔ بس مجھے وہی یاد ہیں کہ ان کی کہانیاں 'آشیاں برباد' اور 'دو بیل' میں نے اپنے سبق میں پڑھی تھیں۔ ان کے سارے جسم میں صرف ان کی مونچھیں اور پورے سر کو ڈھکے ہوئے کھدر کی ٹوپی مجھے یاد رہ گئی۔ میں حیرت سے صرف ان کو دیکھ رہا تھا کہ یہی پریم چند ہیں جن کی کہانیاں ہم ـــ پڑھتے ہیں۔ وہاں گیا پایا

جن میں ہم میں سے اکثر طلبہ شریک ہوتے۔ کبھی کنزرو صاحب کی سروٹس آف انڈیا سوسائٹی کی اسکاؤٹنگ میں ہم شرکت کرتے۔ زمانہ گزرتا گیا ۱۹۳۵-۳۶ کا زمانہ تھا جب کنزرو صاحب امریکہ سے گھوم پھر کر واپس آئے تھے اور الہ آباد میں ان کے چھوٹے موٹے جلسے ہوتے۔ ایک دن ان کے جلسے میں مجھے، میرے ایک استاد پنڈت شیو پرساد پانڈے اپنے ساتھ لے گئے۔ پانڈے جی استاد تو انگریزی کے تھے مگر ہندستانی ادب سے ان کی بڑی دلچسپی تھی۔ وہیں سے وہ مجھے لے کر فراق گورکھپوری کے گھر بینک روڈ پہنچے جہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کوئی میٹنگ ہونی تھی۔ وہاں پہنچا تو بہت سے لوگ موجود تھے۔

گاہے گاہے باز خواں

(پہلی قسط)

ترقی پسند تحریک اور الٰہ آباد

ڈاکٹر سیّد محمد عقیل رضوی (B-80، محمود منزل، دریاباد، الٰہ آباد، یوپی)

ہیں۔ نہ اس وقت مجھے اس کا شعور تھا اور نہ کچھ خیال بس میں مسلسل پریم چند کو دیکھے جا رہا تھا۔ میں سجاد ظہیر صاحب کے اس مکان سے بھی واقف تھا کہ محرم کے زمانے میں ان کے باپ سر سید وزیر حسن، نمبر ۲۰ کیننگ روڈ میں ایک مجلس بھی کرتے تھے اور ہم دوسروں کے ساتھ اس میں شریک ہونے جاتے تھے۔ اب جب سجاد ظہیر کی 'روشنائی' پڑھی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک بے حد تاریخی نشست تھی جس میں انجانے میں شامل ہوکر میں ایک تاریخی کردار بن گیا ہوں۔

پھر اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں ڈوب گیا۔ جنگ شروع ہو چکی تھی اور سب آرٹ لٹریچر، ادبی سرگرمیاں، جنگ کی بھٹی میں جھونک دی گئی تھیں۔ کبھی کبھی پرشوتم داس ٹنڈن پارک میں جواہر لال نہرو جی کی میٹنگیں ہو گئیں

جنھیں میں جانتا تھا ان میں ڈاکٹر اعجاز حسین، مظفر شاہ جہاں پوری، محمود احمد ہنر، میرے دوست تیغ الہ آبادی (مصطفیٰ زیدی) وغیرہ تھے۔ انجمن کا یہ پہلا جلسہ تھا جس میں میں نے شرکت کی۔ اسی جلسے میں ایک طالب علم نے علی سردار جعفری کی نئی آئی ہوئی کتاب 'نئی دنیا کو سلام' پر ایک مقالہ پڑھا۔ اس وقت کوئی کانفرنس انجمن کی ہونے والی تھی جس کے پروگرام بنے۔ فراق صاحب غالباً اس وقت انجمن کے مقامی سکریٹری تھے اور ہندی میں پرکاش چندر گپت تھے۔ میں کانفرنس میں شرکت نہیں کر سکا مگر اس کے متعلق اخبار میں اچھے تبصرے دیکھے۔ اس وقت انجمن کا ممبر ہونا ایک طرح سے انگریزی حکومت کی نظر میں خود کو خاصا مشکوک بنانا تھا۔ پھر میر شب اتنی سستی بھی نہ تھی جتنی بعد کو ہو گئی تھی۔ انجمن صرف دانش وروں

(Intellectuals) کی جماعت کبھی جاتی تھی اور اس جماعت کا ممبر ہونا ادیبوں کو وقار عطا کرتا تھا۔

میرے یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے، انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے الہ آباد میں تقریباً ہر ہفتے وار ہونے لگے۔ ۱۹۴۹ء میں الہ آباد، ترقی پسندوں کی ادبی سرگرمیوں کا تقریباً مرکز بن گیا۔ دیویندر اسر، اس وقت الہ آباد شاخ کے سکریٹری اور نسیم انصاری، تیغ الہ آبادی اور میں، اس کے سرگرم رکن۔ تقسیم کے بعد جو فسادات ہوئے تھے، سارا ہندوستان اس سے متاثر تھا۔ بہت سے لوگ افراتفری میں جانے کہاں سے کہاں جا پہنچے تھے۔ الہ آباد میں ترقی پسندوں کا ایک خاصا بڑا گروپ تھا جن میں فراق، نرالا، پرکاش چندر گپت، سمترا نندن

پنتھ، وامق جونپوری، مسعود اختر جمال، راہی معصوم رضا، اجمل اجملی، دہشت کمار، ناسخ رضوی اور فاروق جنوں، سب اس وقت کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ اسی وقت ساحر لدھیانوی بھی لٹ پٹ کر الہ آباد آ گئے تھے اور اپنی خالہ کے یہاں گڑیا تالاب کے قریب رہتے تھے ہر ہفتے انجمن کی نشستیں ہوتیں۔ کبھی فراق صاحب کے یہاں، کبھی اعجاز صاحب کے یہاں اور کبھی یہاں کے محلے اکبر پور میں مسعود اختر جمال مرحوم کے گھر پر، ان نشستوں میں وامق جونپوری کی نظم 'بھوکا بنگال' سنی گئی، 'پنجاب' پیش کی گئی، ساحر کی نظم 'آہنگ انقلاب' سنی گئی اور ساحر کی مشہور غزل کے شعر:

مرا ماحول تو خیر ایک حقیقت تھا، اب بھی ہے
مگر اس عالم وحشت میں ایمان بربادی

کو بڑی شہرت ملی۔ مقامی شعرا کو شوق ہاتھ آیا اور اس زمین میں بہت سے لوگوں نے غزلیں لکھیں۔ اکثر اتوار کے دن ہم نوجوان، جن میں تیغ اور فاروق جنوں آگے آگے ہوتے۔ مقامی اسلامیہ کالج کے ایک کمرے میں انجمن کی نشستیں کرتے۔ پھر ہم نے اسلامیہ کالج میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے ایک مشاعرہ کیا غالباً ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ شاید ریاض الدین احمد صاحب اس وقت اسلامیہ کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے جو ہمارے بڑے مددگار تھے۔ انجمن کا یہ مشاعرہ بہت کامیاب مشاعرہ ہوا۔ اس میں مجاز نے گاندھی جی کی شہادت پر لکھا گیا یہ شعر بھی سنایا تھا:

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

(باقی آئندہ)

گاہے گاہے باز خواں

اردو ادب اور قومی یکجہتی

دوسری اور آخری قسط

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

اردو ادب پر غور کرتے وقت ہمیں ہندوستان کے طبعی ماحول پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔ یہاں کے موسم مقرر ہیں، ان میں زیادہ افراط و تفریط نہیں ہے۔ یہاں حقیقت ایسے زماں میں کام کرتی ہے جو معمور اور مسلسل ہے اور بہ اعتبار پیمائش دائری ہے۔ یہاں کائنات ناقابل انصرام صورت میں پھیلی ہوئی ہے اور شدت حیات کے ساتھ متحرک رہتی ہے۔ بظاہر ان مختلف مناظر میں بہت فرق ہے لیکن غور کیجیے تو ساری موجودات اپنی کثرت اور بوقلمونی کے باوجود ایک حقیقت نظر آتی ہے۔ موضوع کی وحدت، معروض کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے یا تصوف کی اصطلاح میں بندہ و بندہ نواز، عاشق و معشوق کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ یہی خصوصیت ہندوستانی ذہن کی ہے۔ وہ کائنات کی تعمیر میں اور نظام فکر کی تعمیر میں متعدد اور مختلف مظاہر کو ایک قضیے کے تحت لاکر ہمیشہ ان میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی عمل اس ترکی ایرانی ورثے کے ساتھ ہوا جو ۱۲۰۶ء کے بعد ہندوستانی زندگی میں سرایت کر گیا تھا اور جسے ہندوستانی ذہن نے ترکیب و امتزاج کے ذریعے اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔

مغلوں کے زمانے میں، جو مغل بندی اور پیوند کاری کے تجربات سے گزر چکے تھے، یہ تہذیبی نقش اور زیادہ حسین ہو گیا۔ انھوں نے ترکوں کی سخت کوشی، فراخ دلی اور خودداری میں ایرانیوں کی لطافت اور شائستگی اور مساوات اور اخلاقی ضبط کی قلم لگا کر ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی اس طرح آبیاری کی کہ وہ ایک تناور درخت بن گئی اور اس کی جڑیں جمالیاتی شعور اور تصوف کی انسان دوستی تک پہنچ گئیں۔ اس زمانے کی عمارتیں، تصویریں، تصوف کی تحریکیں اور شعر و موسیقی کے کارنامے سب اس امتزاج اور اتحاد پسندی کے آئینہ دار ہیں۔ مثال کے طور پر معرفت یا تصوف کے اس نئے راگ پر غور فرمائیے جو ہندوستان کے طبعی ماحول میں اسلامی اثر سے پیدا ہوا۔ اس میں عاشقانہ ذوق و شوق، سوز و ساز تسلیم و رضا کے ساتھ ساتھ مسلمانہ بلکہ مجاہدانہ جوش و خروش بھی ہے۔ ایک طرف تمنائے عشق ہے، ذات الٰہی کی محبت اور مرشد کی عقیدت سے معمور اور دوسری طرف ترکوں کا نعرۂ جنگ ہے۔ ظاہری رسوم و روایات، ریاکارانہ عبادات اور توہمات کے خلاف غالب، حسین شاہ، میرزا مظہر جان جاناں، میر تقی میر، خواجہ میر درد اور غالب کے متصوفانہ خیالات کو سامنے رکھیے، سب میں یہی ہندی لے کارفرما ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندو باطنیت اور اسلامی تصوف باہم مل گئے ہیں۔ اسی طرح فتح پور سیکری، احمد آباد اور سری نگر کی عمارتوں میں، خیال اور دھرپد میں، منوہر اور عبدالصمد کی تصویروں میں، امیر خسرو، میرزا مظہر، خواجہ میر درد، نظیر اور غالب کی شاعری میں یہ امتزاجی لہر صاف نظر آتی ہے۔ یہاں امتیازات مٹ گئے ہیں اور فنون لطیفہ نے اپنے حدود کے اندر ہندوستانی روح کو پالیا ہے۔

اسلام اور ہندو سماج کا سابقہ تاریخ عالم کا عجیب و غریب واقعہ ہے۔ اسلام توحید پرستی پر زور دیتا ہے اور شرک کا شدت سے مخالف ہے۔ قیامت کے روز ہر گناہ معاف ہو جائے گا لیکن شرک کی معافی نہیں ہوگی۔ کلمے میں پہلے تمام خداؤں کی نفی کرتا ہے اور پھر خدائے واحد کا اقرار۔ اس کے برخلاف ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہر صورت خدا کا مظہر ہو سکتی ہے۔ بقول دارا شکوہ ''در ہمہ اوست ظاہر و ہمہ از وست جلوہ گر۔ اول اوست و آخر اوست و غیر او موجود نباشد''۔

اردو کے دانشوروں اور صوفیوں کے یہاں پہلی دفعہ یہ بات پوری صراحت کے ساتھ بیان ہوتی ہے کہ ہندو بھی ایسے ہی توحید پرست ہیں جیسے کہ مسلمان۔ اردو کے مشہور شاعر اور محسن مرزا مظہر جان جاناں نے جو ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۸۰ء میں شہید ہوئے، اپنے ایک خط میں ہندوؤں کے آئین و مذہب کے متعلق لکھا ہے:

''واضح رہے کہ اہل ہند کی قدیم کتابوں سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ نوع انسانی کی پیدائش کے شروع میں رحمت الٰہیہ نے معاد و معاش کی اصلاح کے لیے ایک کتاب مسمّٰی بہ وید جس میں چار دفتر ہیں اور امر و نہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کے اخبار ہیں، ایک فرشتے برہما نام کے وسیلے سے، جو ایجاد عالم کا آلہ ہے، بھیجی۔ اس کے مجتہدوں نے اس میں سے چھ مذہب استخراج کیے اور اصول و قواعد کی بنا انھیں پر قائم کی۔ اس کو دھرم شاستر کہتے ہیں، یعنی فن الٰہیات، جسے علم کلام بھی کہتے ہیں ... ان کے تمام فرقے توحید الٰہی کے بارے میں متفق ہیں۔ عالم کو مخلوق جانتے ہیں۔ فنائے عالم، نیک و بد کی جزا و سزا، حشر جسمانی اور حساب و کتاب کے قائل ہیں۔ علوم عقلی و نقلی، ریاضیات، مجاہدات، تحقیق معارف اور مکاشفات میں بڑے ماہر ہیں۔ ان کی بت پرستی شرک کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کے دوسرے اسباب ہیں... ان کے عقلمندوں نے انسانی عمر کے چار حصے کیے ہیں۔ پہلا تحصیل علم کے لیے، دوسرا معاش اور اولاد کے لیے، تیسرا اعمال کی تصحیح اور نفس کی اصلاح کے لیے، چوتھا تجرد و تنہائی کی مشق کے لیے، جو کمال انسانی کا انتہائی درجہ ہے اور نجات کبریٰ اس پر موقوف ہے''۔

آخر میں مرزا مظہر جان جاناں لکھتے ہیں:

''ہر ایک امت کا رسول ہوتا ہے۔ سرزمین ہندوستان میں بھی نبی اور رسول کی بعثت واقع ہوئی ہے اور ان کے احوال ان کی کتابوں میں مندرج ہیں۔ رحمت عام الٰہی نے مصلحت انسانی کو اس وسیع سلطنت میں فروگذاشت نہیں کیا''۔

آخر میں فرماتے ہیں:

''قدیم ہندوؤں کی بت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ بعض فرشتے جو حکم الٰہی سے عالم کون و فساد میں کچھ دخل رکھتے ہیں یا کاملوں کی بعض روحیں جنھیں جسم سے الگ ہو کر اس دنیا میں کچھ تصرف حاصل ہے یا بعض زندہ آدمی جو ان کے زعم میں حضرت خضر علیہ السلام کی طرح ہمیشہ کے لیے زندہ ہیں، ان کی مورتیں یا تصویریں بنا کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس توجہ کے سبب مدت کے بعد اس صورت والے سے مناسبت پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ذکر رابطہ سے ملتا ہے جو اسلامی صوفیہ میں عام ہے اور جس میں پیر کی صورت کا تصور کیا جاتا ہے۔ یہ بات کفار عرب کے عقیدے سے مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ وہ بتوں کو متصرف اور موثر بالذات مانتے تھے نہ کہ آلۂ تصرف الٰہی۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ تناسخ پر اعتقاد کرنے سے کفر لازم نہیں آتا''۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو کے شاعروں، مفکروں، صوفیوں اور دانشوروں کے ذریعے قومی یکجہتی کا دائرہ مکمل ہو گیا اور ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو نظری خلیج حائل تھی وہ بھر گئی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر جگہ لکم دینکم ولی دین پر زور دیا ہے، تم اپنے دین پر میں اپنے دین پر، یعنی ایک نے دوسرے کے عقیدوں سے تعرض نہیں کیا اور انسان دوستی، دردمندی اور معاشرتی یگانگت کی سطح پر اس طرح مفاہمت کر لی کہ دونوں میں فرق کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہندو مصنفین لکھتے ہیں تو حمد، نعت اور منقبت سے شروع کرتے ہیں اور مسلمان جب برج بھاشا، اودھی یا بنگالی میں لکھتے ہیں تو ابتدا شری گنیش جی اور شری سرسوتی جی سے کرتے ہیں۔ اگر نام کو ہٹا دیا جائے تو یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ مصنف ہندو ہے یا مسلمان۔

اس پس منظر میں مرزا مظہر کے ان اشعار پر غور فرمائیے:

آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے
جاتا ہے جب سے مجھ بے نوا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دل نازک کو اپنے تو
یہ شیشہ پڑتا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

اٹھارویں صدی کے اکابر صوفیہ میں خواجہ میر درد کا بھی شمار ہوتا ہے جو مرزا مظہر کے ہم خیال ہیں۔ جگرداری، بلند خیالی اور ناموافق حالات میں صبر و تحمل ان کا ایسا ہے آج بھی سرمایۂ تسکین ہے۔ دہلی میں وہ تمام عمر خوں کے شناور رہے لیکن آستانہ یار سے نہ اٹھے۔ انھوں نے گرم و سرد زمانہ کو اپنے دل اور جگر میں سمو لیا لیکن حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ مجاز و حقیقت کا یہ پیوند ملاحظہ ہو:

کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے
تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

تصوف کا اصلی مایۂ خمیر عشق حقیقی ہے۔ میر فرماتے ہیں:

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق معشوق، عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

اسی لیے عالم حقیقت کفر و اسلام دونوں سے بالاتر ہے اور پروانہ، چراغ حرم و دیر میں فرق نہیں کرتا:

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

تصوف میں ادراک کا محل دل ہے جو ایک مضغۂ گوشت نہیں بلکہ تمام مکاشفات اور واردات اسی لطیفۂ روحانی

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

تیسری اور آخری قسط

علامہ اقبال کا تصورِ تقدیر

پروفیسر محمد منور

حضرت علامہ لکھتے ہیں: "یوں بھی ارتقائے حیات پر نظر رکھی جائے تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ شروع شروع میں تو اگرچہ مٹی کا نفس پر غلبہ ہوتا ہے لیکن پھر جیسے جیسے نفس طاقت حاصل کرتا ہے مٹی پر چھا جاتا ہے اور اس لیے یہ ممکن ہے کہ آخر الامر اس سے بالکل آزاد ہو جائے۔"[23]

آخر الامر وہ جبلت اور تسلط سے آزاد ہو جائے، یہ بالکل ممکن ہے مگر درمیانی منزل کھینچا تانی کی منزل ہے۔ روح اوپر کو کھینچتی ہے، بدن نیچے کو۔ "کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے"۔ اکثر افراد وہ ہیں جو جبلت کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور بدن کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ قرآن کا ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے: ولو شئنا لرفعناہ بہا و لکنہ اخلد الی الارض واتبع ھواہ[24] (اگر ہمیں اپنی مرضی کرنا ہوتی تو ہم اسے اپنی نشانیوں کی مدد سے اوپر کو اٹھاتے، لیکن وہ تو زمین کے ساتھ چپکتا چلا گیا اور اپنی ہوس کا بندہ ہو کر رہ گیا)۔

ایک طرف مٹی کی تاثیر اور نیچے کی کشش، دوسری طرف روح خالق کے ذوات کا یقین، صاحب "عجائب المخلوقات" قزوینی کے بقول: "اول مراتب ھذہ الکائنات تراب و آخرھا نفس ملکیۃ طاھرۃ"[25] یعنی ممکنات میں اول درجہ مٹی کا ہے اور آخری درجہ پاک ملکی نفس کا ہے۔ اس اثنا میں جاذ اور کھینچا تانی میں ممکن ہے آدمی بے بس ہو کر رہ جائے یا ممکن ہے اندرونی کھینچا تانی کی کیفیت سے کوئی فیصلہ کر ہی نہ سکے۔ لہٰذا خدا کو صحیح جان کر طلب کرنے لگے۔ ہر فیصلہ ایک تقدیر ہے جس کے انتخاب اور اختیار کا نفع و نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ عالم خلق اور عالم امر ساتھ ساتھ ایک ہی وجود میں ہیں۔ قریب ترین ہمسائے اور ہمدم ہیں، لہٰذا ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، جن پر حیوانیت حاوی رہتی ہے ان کی کشمکش کمزور ہو جاتی ہے اور وہ نسبتاً آرام میں رہتے ہیں مگر جو حیوانیت کی سطح سے اوپر ابھر رہے ہوں انہیں ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے اور نفس لوامہ کی جانب سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ نفس لوامہ برے جذبوں کو کیوں مارتا ہے۔ "نہ جانے گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو"۔ نفس لوامہ تو اس کو شکار کرنے کے درپے رہے گا جسے دھر پکڑنا ضروری ہوگا، جو آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایسے عالم میں یوں بھی ہوتا ہے کہ نفس لوامہ اوپر کی آواز بن کر کارفرما ہو اور سننے والا اسے فرشتے کی آواز اور پاکیزہ الہامی اشارہ جان لے اور اس طرح گمراہ ہو کر مارا جائے۔ ممکن ہے وہی آواز سالک کو ہوس اور تکبر کی راہ پر ڈال دے۔ حضرت علامہ نے بڑے پیارے استعاروں میں یہ بات سمجھائی ہے:

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

لہٰذا فطرت جبلت و خلق طبیعت سے ہر لحظہ ہدایت طلب کرتے رہنا اور بہتر تقدیر کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے!
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے![26]

دوسرا شعر خصوصاً توجہ طلب ہے۔ علامہ کے شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا دعا خود مانگنے والے پر اثر کرتی ہے اور اس طرح دعا کرنے والے کے اندر تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اور یہ بالکل واضح ہے، وہ اس طرح کہ جب دعا مانگی جاتی ہے تو اس طرح سے خود اپنے آپ کو یاد دلایا جاتا ہے کہ یہ یا وہ مقصد حاصل کرنا ہے۔ یہ بار بار کی یاد دہانی عزم میں استقامت پیدا کرتی ہے اور پھر عزم کی استقامت کا درجہ جوں جوں بلند ہوتا ہے توں توں دعا مانگنے والے کی اہلیت اور معیار (Category) بدلتا چلا جاتا ہے۔ اس میں اہلیت کی مقدار عزم کے معیار کے مطابق بڑھتی ہے۔ اللہ کے فیصلے نہیں بدلتے مگر وہ فیصلے نااہل کے لیے اور ہیں اور اہل کے لیے اور۔ تقدیر تو وہی رہتی ہے مگر آدمی اپنے اندر تقدیر کے شایان شان استحقاق پیدا کر لیتا ہے۔ سہولت بیان کی خاطر ہم اپنی تبدیلی کو تقدیر کی تبدیلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ تقدیر باہر سے نہیں بدلتی، اندر سے بدلتی ہے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست
زانکہ تقدیرات حق لا انتہاست[27]

تو اگر نئی تقدیر کا طالب ہو تو یہ بالکل جائز ہے اس لیے کہ اللہ کی تقدیر ایک نہیں، اس کی تقدیریں بے حد و حساب ہیں۔ قرآن کریم میں آتا ہے: "و خلق کل شیء فقدرہ تقدیرا"[28] (اللہ نے ہر شے پیدا کی اور اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ مقرر کر دیا)۔ ہر شے کے خواص اور امکانات اس کی تقدیر ہیں۔ مٹی باریک ہو تو اسے ہوا اڑا لے جاتی ہے، جم کر ٹھوس ہو جائے تو پھر آندھیاں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، اس لیے کہ اس کی تقدیر بدل چکی ہوتی ہے۔ پہلی تقدیر غبار کی تقدیر تھی، دوسری تقدیر پتھر کی سی تقدیر بن چکی تھی۔ مٹی پانی کو جذب کر سکتی ہے، گرمی اور سردی کو بھی جذب کر سکتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ جتنے امکانات ہیں اور یہ سب خاک کی تقدیریں ہیں۔ خاک کی ہر تبدیلی تقدیر کی تبدیلی ہے۔ پتھر شیشے سے ٹکرائے تو کیا کیفیت ہوتی ہے، وہی پتھر بکھر جائے تو بے شک اسے بھی ہوا اڑا لے جائے۔ پانی کے عمودی امکانات ظاہر ہیں۔ ایک خاص درجے پر سرد ہو کر منجمد ہو جائے تو اس کی تقدیر چٹانوں کی اور فرشِ سنگ کی تقدیر اور ایک خاص درجے پر گرم ہو کر بخار بن جائے تو اس کی تقدیر ہوا کی تقدیر ہوتی ہے۔ لوہے میں آگ سمائی ہو تو آگ کی طرح جلانے لگتا ہے اور زیادہ گرم ہو جائے تو موم کی طرح ہر صورت میں ڈھلنے لگتا ہے۔ موم منجمد ہو جائے تو اس کا تقدیری رشتہ سنگ سے استوار ہو جاتا ہے، پھر وہ ٹوٹ تو سکتی ہے مگر مختلف شکلوں میں ڈھل نہیں سکتی۔ غرض ہر شے کے امکانات کا صحیح اندازہ اس کی تقدیر ہے اور ہر شے میں جو جو تبدیلی واقع ہو اسے ہم تبدیلی تقدیر کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح جماتی تقدیریں اور حیوانی تقدیریں ہیں، بے حد و حساب، لاانتہا۔ آدم میں مشاہدہ و تجربہ سے متاثر ہونے کی اہلیت موجود ہے اور خواص اشیا سے آگہی اس کی وہ فضیلت ہے جس نے اس کے روبرو فرشتوں کو عاجز کر دیا تھا۔ اگر علم و آگہی کی بے پناہ وسعت کے باوصف وہ اپنے لیے کوئی بہتر معیار اور پیمانہ مقرر نہیں کر سکتا تو گویا وہ اپنی تقدیری صلاحیتوں کو کام میں لانے سے قاصر رہا۔

ہر شے صورت اور وضع کی تبدیلی کے ساتھ گویا تبدیلی تقدیر کا مزا دیتی ہے۔ ابن مسکویہ لکھتے ہیں: "فان الفرس اذا قصر عن کمالہ و لم تظہر افعالہ الخاصۃ بہ علی افضل احوالہا حط عن مرتبۃ الفرسیۃ و استعمل بالاکاف کما تستعمل الحمیر و کذلک حال السیف و سائر الآلات متی قصرت و نقصت افعالہ الخاصۃ بہا حطت عن مراتبہا و استعملت استعمال مادونہا"[29]

یعنی جب گھوڑا اپنا کمال کھو بیٹھتا ہے اور اس کی طرف سے وہ افعال بروئے کار نہیں آتے جو اس کے بہترین احوال میں بروئے کار آنے چاہئیں تو وہ اپنا "گھوڑاپن" کھو بیٹھتا ہے اور پھر اس پر پالان ڈال کر اسے اسی طرح استعمال کیا جانے لگتا ہے جس طرح گدھوں کو۔ یہی حال شمشیر اور دیگر آلات کا ہے کہ جب وہ اپنے افعال خاصہ کی بجا آوری میں کوتاہ اور کم عیار ثابت ہوں تو اپنے مرتبے سے گر جاتی ہے اور کمتر مرتبے کی چیزوں کی طرح برتی جانے لگتی ہے۔

گھوڑا اپنے کمال خواص کے عالم میں بڑی شان دار سواری ہے، وہ اپنے مالک کے لیے نشان عزت ہے لیکن محروم کمال ہو تو اس پر بھی اسلحہ، چارہ اور کوڑے لادے جانے لگتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کی تقدیر گھوڑے کی تقدیر نہیں رہتی، بلکہ وہ گدھے کی تقدیر کا مالک بن جاتا ہے۔ شمشیر اگر شمشیر کا خاصہ کھو بیٹھتی ہے تو پھر کمتر مرتبے کی چیز اس میں ڈھلنے لگتی ہے، کھرپا وغیرہ بن جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ شمشیر کی تقدیر اور ہے، کھرپے اور درانتی کی تقدیر اور۔ شمشیر والا غازی کہلاتا ہے اور کھرپے والا گھسیارا۔ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ جو بھینس خشک ہو جائے (جسے پنجابی میں [illegible] کہتے ہیں) اس کی ناز برداری کوئی نہیں کرتا۔ اس کے چارے، پانی اور نہلانے دھلانے کا وہ اہتمام ختم ہو جاتا ہے جو اس کے بھینسوی خواص یا امکانات کے باعث عمل میں آتا ہے۔ چناں چہ اسے یا تو قصائی کے حوالے کر دیا جاتا ہے یا بیل کے ساتھ ہل میں جوت دیا جاتا ہے اور پھر وہ جب تک یہ کام کرتی رہتی ہے اس کی تقدیر وہی ہوتی ہے جو بیل کی تقدیر، گو شکل بھینس ہی کی رہتی ہے۔ بھینس، گدھا، گھوڑا، گدھ، عقاب، کیڑا، شیر، الماس، شبنم، غبار، آہن غرض کہ ہر شے کے امکانات کے بارے میں بربنائے تجربہ و مشاہدہ جو تخمینہ و اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے وہ اس شے کی تقدیر ہے اور تقدیر کا یہ مفہوم حضرت علامہ نے بلاشک قرآن کریم سے اخذ کیا: "والقمر قدرناہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم"[30] "و خلق کل شیء فقدرہ تقدیرا"[31] اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ:

دگر یار بگش بر نے مضمر است
تو اگر دیگر شوی او دیگر است[32]

الغرض حضرت علامہ کے تصور تقدیر سے جو تلقین ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جملہ معیار اور پیمانے آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ گویا امکانات و تقدیرات کا کارخانہ کھلا ہے۔ خلوص کے ساتھ تقدیر انتخاب کیجیے اور پھر اس تقدیر کے حصول کی خاطر اپنے اندر

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دُنیا

قطر کے عالمی اردو ادب ایوارڈ سے پروفیسر شریف حسین قاسمی سرفراز



نئی دہلی (۲۳ اپریل)۔ اس سال 18 واں مجلس فروغ اردو ادب ایوارڈ دوحہ قطر جیوری کی میٹنگ نئی دہلی میں منعقد ہوئی جس میں اردو فارسی کے ممتاز ادیب اور محقق پروفیسر شریف حسین قاسمی کو یہ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، طلائی تمغہ اور سپاس نامہ پر مشتمل ہے۔ جیوری کے چیئرمین پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایوارڈ کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایوارڈ پروفیسر قاسمی کی ادب و تحقیق کے شعبے میں مجموعی خدمات کے لیے دیا جارہا ہے۔ جیوری آف جج کا اجلاس پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں منعقد ہوا۔ اراکین جیوری میں پروفیسر شافع قدوائی اور پروفیسر ابن کنول شامل تھے۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ پروفیسر شریف حسین قاسمی اردو اور فارسی کے صف اول کے ان ادیبوں اور محققین میں ہیں جن کو پایۂ اعتبار و افتخار حاصل ہے۔ وہ گزشتہ ۵۵ برس تک دہلی یونیورسٹی میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ہرچند کہ وہ فارسی کے پروفیسر تھے لیکن ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں اور تحقیقات کا فیضان اردو زبان و ادب کو پہنچا ہے۔ وہ نہ صرف ہندستان بلکہ پاکستان اور ایران کے چوٹی کے علما میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر 150 سے زائد تحقیقی مقالات بھی لکھے ہیں۔

قابل غور ہے کہ مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے چیئرمین جناب محمد عتیق ہیں۔ ان کی اطلاع کے مطابق اس سال پاکستان میں ایوارڈ کا اعلان ۳ رجون ۲۰۱۴ کو کیا جائے گا۔

پروفیسر شریف حسین قاسمی یکم مارچ ۱۹۴۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں دوبار صدر شعبہ رہے اور ڈین، فیکلٹی آف آرٹس کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ 70 سالہ پروفیسر قاسمی نے الطاف حسین حالی کی 'یادگار غالب' کا فارسی میں بہترین ترجمہ کیا ہے۔ ان کے کاموں میں مرزا سنگین بیگ کی 'سیر المنازل'، 'ذکر جامع اولیاے دہلی'، 'دیوان حافظ'، 'ہندستان کے ذخائر میں موجود قلمی نسخوں کا جامع کیٹلاگ'، 'فردوسی کے شاہنامہ کا جملہ پرفیڈ کیٹلاگ' قابل ذکر ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے ہندستان کے فارسی میں جملہ مقدس صحیفوں کا ایک جامع کیٹلاگ شائع کیا ہے جو ویدوں، پرانوں اور مہابھارت سے لے کر گیتا، وحشت اور خود کہانی کے ڈھائی ہزار سے زائد قلمی نسخوں پر مبنی ہے۔ اس سے قبل ان کی تحقیقی و تنقیدی خدمات کے اعتراف میں انھیں دہلی اردو اکادمی ایوارڈ اور غالب ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

پروفیسر شریف حسین قاسمی کو یہ ایوارڈ دیے جانے پر مختلف ادبی شخصیتوں نے انھیں مبارک باد دی ہے۔

★★★

اردو کے لیے وسیع پیمانے پر کام کرنے کی ضرورت

نوح میوات (۲۳ اپریل)۔ ریاست ہریانہ میں اردو اکادمی کے قیام کے باوجود اردو زبان کو وہ فروغ نہیں ملا جس کا علاقہ میوات مستحق ہے۔ ریاستی سطح پر اگر نظر کی جائے تو علاقہ میوات وہ علاقہ ہے جہاں اردو کے قارئین کی تعداد بہت زیادہ ہے، تاہم ریاستی حکومت اردو زبان کے تئیں اگر سنجیدہ ہوتی تو یہاں پر اردو زبان کو بہت زیادہ فروغ و استحکام حاصل ہوتا۔ میوات میں اردو زبان کی حالت زار یہ ہے کہ اردو زبان کے خواہش مند طلبہ اور طالبات چاہتے ہوئے بھی اسکولوں میں اردو کی تعلیم حاصل نہیں کر پا رہے ہیں، کیوں کہ سرکاری اداروں میں نہ تو حکومت اردو اساتذہ مہیا کرنے کے لیے سنجیدہ ہے اور نہ ہی علاقے کی کوئی سیاسی شخصیت اردو زبان کے فروغ کے لیے فکرمند ہے اور مستقبل قریب میں بھی کوئی پیش رفت ہوتی نظر نہیں آرہی ہے۔ اس صورت حال میں اردو کا مستقبل نسل نو کے درمیان تاریک ہوتا نظر آرہا ہے، جس سے اردو داں طبقے میں پوری طرح مایوسی پائی جارہی ہے، جب کہ قدیم دستاویزات تھانوں اور تحصیلوں وغیرہ کے اردو زبان میں ہیں اور موجودہ دور میں بھی تھانوں و تحصیلوں میں اردو زبان کے محاورات ہی استعمال کیے جارہے ہیں۔ اس سلسلے میں جب مولانا یحییٰ کریمی سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میوات میں اردو اگر کسی حد تک زندہ ہے تو اس میں اہم کردار مدارس اور مکاتب کا ہے، جس سے علاقے میں کسی نہ کسی صورت میں اردو کی اشاعت جاری ہے۔ بے شمار مطالبات کے بعد امسال مولانا آزاد یونیورسٹی کا نوح میں ریجنل سینٹر کے قیام کی بنیاد ضرور ڈالی گئی ہے جس سے اردو داں طبقے میں کچھ امید پیدا ہوئی ہے، تاہم اس سلسلے میں اردو کے مزید فروغ کے لیے ہریانہ اردو اکیڈمی کو ریاست میں خاص طور سے میوات میں اردو کے روشن مستقبل کے لیے وسیع پیمانے پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ (انقلاب۔ دہلی)

1997 کے معلمِ اردو سند یافتگان کاؤنسلنگ کے حق دار

عدالت کا فیصلہ

مظفرنگر (۲۷ اپریل)۔ جامعہ اردو علی گڑھ سے 1997 میں معلم اردو کی سند حاصل کرنے والے بے روزگاروں کو ہائی کورٹ نے جائز مانتے ہوئے انھیں کاؤنسلنگ میں شامل ہونے کے لیے کہا ہے۔ اس سے قبل سرکار نے ۱۱ اگست 1997 تک مذکورہ سند حاصل کرنے والوں کو ہی اس کا مستحق سمجھا تھا مگر اب ہائی کورٹ نے واضح کر دیا ہے کہ جن طلبہ، طالبات کو 1997 میں معلم اردو کی ڈگری ملی ہو وہ کاؤنسلنگ کے مستحق ہوں گے۔ الٰہ آباد کے عبدالحمید کی رٹ پر ہائی کورٹ کے جسٹس وکرم ناتھ نے گزشتہ روز یہ فیصلہ سنایا جس کے بعد پوری ریاست کے پانچ ہزار سے زائد معلم اردو سند یافتگان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے جن کو 1997 میں یہ ڈگری مل گئی تھی۔ رٹ دائر کرنے والے نے رٹ کی بنیاد پر سپریم کورٹ کے معروف فیصلہ سریش پال بنام ہریانہ سرکار بنس (405)1996 کو قرار دیا تھا جس میں سماعت کے دوران جسٹس وکرم ناتھ نے تسلیم کیا کہ جب طلبہ و طالبات نے 1997 میں داخلہ لے لیا تو اس کا نتیجہ نکلنے کی ذمہ داری ان پر نہیں ہوتی جب کہ جامعہ اردو علی گڑھ 1997 میں پوری طرح سے منظور شدہ ادارہ تھا۔ ایسی صورت میں ہزاروں طلبہ و طالبات کے مستقبل کے ساتھ کھلواڑ نہیں کیا جا سکتا۔ رٹ عرضی نمبر 22485/2014 میں سماعت کے دوران ایڈوکیٹ ایس ٹی ایچ جیلانی نے چیشتر کا انڈوز رکھا جس میں ہائی کورٹ میں پہلے صادر ہوئے محمد نسیم احمد کے فیصلہ کا بھی حوالہ دیا گیا جس میں ہائی کورٹ نے تسلیم کیا تھا کہ خواہ نتیجہ 11 اگست 1997 کے بعد آیا ہو لیکن داخلے اس تاریخ سے پہلے ہو چکے تھے اس لیے یہ ڈگری جائز ہوگی۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

عربی و فارسی کو دوبارہ یوپی ایس سی میں بحال کرنے کے لیے ٹھوس اقدام کی ضرورت

نئی دہلی (۲۴ اپریل)۔ عربی و فارسی زبانوں کو دوبارہ یو پی ایس سی میں بحال کرنے کے لیے منظم اور ٹھوس اقدام کی ضرورت ہے۔ یہ بات آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس کے صدر پروفیسر محمد نعمان خاں نے ایسوسی ایشن کی میٹنگ میں کہی۔ موصوف نے اپنی گفتگو میں سب سے پہلے دہلی ہائی کورٹ کے معروف وکیل محمد شاہد کا شکریہ ادا کیا جن کی کوششوں سے سپریم کورٹ نے عربی و فارسی زبانوں کو دوبارہ یوپی ایس سی میں بحال کیے جانے کا عندیہ دیا ہے۔ انھوں نے شاہد صاحب کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ عربی و فارسی زبانوں کا یوپی ایس سی سے نکالا جانا ایک افسوس ناک واقعہ ہے جس کی مذمت ایسوسی ایشن کے اراکین و ممبران کے ساتھ ساتھ ملک گیر پیمانے پر مدارس و جامعات اور مرکزی و ریاستی یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبہ کرتے آئے ہیں جس کی متعدد ممتاز شخصیات و ممبران پارلیمنٹ نے بھی حمایت کی ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے یوپی ایس سی کے چیئرمین سے لے کر وزیر برائے فروغ انسانی وسائل تک رسائی حاصل کی اور کئی ممبران پارلیمنٹ کے توسط سے جن میں آزاد ممبر پارلیمنٹ محمد ادیب صاحب کا نام قابل ذکر ہے، متعدد بار حکومت کو میمورنڈم بھی دیا لیکن افسوس کہ حکومت ہند اس مسئلے کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہی ہے اور اتنے حساس مسئلے کو سرد بستے میں ڈال دیا ہے۔ واضح ہو کہ یوپی ایس سی نے پچھلے دو تین امتحانات سے عربی و فارسی دونوں زبانوں کو یورپی زبانوں کے زمرے میں شامل کر کے یوپی ایس سی کے امتحانات سے انھیں خارج کر دیا ہے اور ان زبانوں کو پڑھنے اور سیکھنے والے لاکھوں طلبہ کو یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں بیٹھنے سے نہ صرف محروم کیا ہے بلکہ ان کے لیے روزگار کے دروازے بھی بند کر دیے ہیں۔ ہندی اور سنسکرت کی طرح عربی، فارسی زبانیں بھی ملک کی قدیم زبانیں ہیں اور یہاں کے باشندے ہمیشہ سے ان زبانوں میں لکھتے پڑھتے اور بولتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت ہند عربی و فارسی کے اساتذہ اور اسکالروں کو اسی طرح انعامات سے نوازتی ہے جیسے سنسکرت کے اساتذہ اور اسکالرس کو۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم حکمرانوں نے اپنے دور حکمرانی میں ان زبانوں کو نہ صرف پروان چڑھایا بلکہ انھیں سرکاری زبان کا درجہ بھی دیا۔ مغل سلطنت میں جہاں ایک طرف عربی زبان دکن کے کچھ علاقوں میں دفتری زبان تھی، وہیں دوسری طرف فارسی پورے مغل سلطنت کی سرکاری زبان رہی ہے، یہاں تک کہ انگریزوں نے ان کی رائج کردہ دیوانی اور کورٹ کی اصطلاحات کو برقرار رکھا، جس کا مشاہدہ آج بھی عدالتوں میں کیا جا سکتا ہے۔ اس میٹنگ میں مستقبل کے لیے لائحہ عمل کے لیے ایجنڈا طے کیا گیا اور ملک گیر پیمانے پر احتجاجی جلسے جلوس، سمپوزیم کے انعقاد کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر پرامن دھرنے اور ریلیاں کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ میٹنگ میں پروفیسر محمد نعمان خاں، پروفیسر حبیب اللہ خاں، ڈاکٹر حسنین، ڈاکٹر ولی اختر، ڈاکٹر قوزان احمد، ڈاکٹر نعیم الحسن اثری، ڈاکٹر مجیب اختر اور ڈاکٹر محمد اکرم نے شرکت کی۔

(انقلاب۔ دہلی)

اے ایم یو میں اردو زبان میں لکھے چیک قبول

کیمپس میں واقع ایس بی آئی برانچ کی چو طرفہ ستائش

علی گڑھ (۳ مئی)۔ اردو زبان کی ترقی اور بقا کے لیے مرکزی اور صوبائی سطح پر وعدے اور دعوے تو بہت کیے جاتے ہیں مگر اس کو عملی جامہ پہنانے میں اٹھنے والے قدم کسی نہ کسی سبب تھم جاتے ہیں لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں واقع اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی شاخ نے ایک قدم بڑھایا ہے۔ جس کی چوطرفہ ستائش کی جارہی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کیمپس میں واقع اسٹیٹ بینک میں اردو زبان میں لکھے ہوئے چیک قبول کیے جارہے ہیں جو ایک خوش آئند پہلو ہے۔ منیجر اسٹیٹ بینک آف انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شاخ کی مرضی سے شروع کی گئی اس پہل کا ملک برادری نے استقبال کیا ہے۔ اسٹیٹ بینک کے منیجر پریتم کمار نے بتایا کہ گزشتہ کچھ دنوں سے یونیورسٹی اساتذہ اور ملازمین کی جانب سے مطالبہ کیا جارہا تھا کہ اردو میں لکھے ہوئے چیک تسلیم کیے جائیں، ہم نے وکلوں کا خیال رکھتے ہوئے اردو زبان میں لکھے ہوئے چیک لینے کا فیصلہ لیا ہے، انھوں نے بتایا کہ بینک افسران یا حکومت کی جانب سے ایسا کوئی لکھا شدہ قانون نہیں ہے کہ اردو میں چیک نہ لے جائیں یہ صرف ہم نے اپنے بینک میں کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بینک کا اصل کام عوام کو بہتر سہولیات دینے کا ہوتا ہے اور اس کوشش سے ہمیں اپنے کسٹمر بھی ملیں گے۔ بزم اردو کے صدر خالد انصاری نے بتایا کہ یہاں بہت دنوں سے مطالبہ کیا جارہا تھا کہ اردو میں چیک تسلیم کیے جائیں، منیجر کے کہنے پر اردو میں چیک وصول کیے جارہے ہیں اور عوام کو اس سے باخبر کرنے کے لیے ایک اعلانیہ بھی چسپاں کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک اچھی شروعات ہے۔ لوگوں کی خواہش تھی اس کی شروعات اے ایم یو سے ہونی چاہیے تھی اور وہ ہوئی ہے۔ لوگوں کی اب یہ کوشش ہونی چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ اردو میں چیک لائیں تاکہ اردو خواندہ لوگوں کی ملازمت کی بھی ضرورت بڑھے اور یہاں سے شروع ہوئی یہ پہل پورے ہندوستان میں پھیلے۔ ریسرچ اسکالر محمد فرقان نے بتایا کہ الٰہ آباد کی اردو ڈیولپمنٹ کمیٹی نے بھی الٰہ آباد ہائی کورٹ میں رٹ کی تھی کہ اردو کے لکھے ہوئے چیک تسلیم کیے جائیں لیکن اس کی پہل آج اے ایم یو سے ہوئی ہے یہ ایک اچھی شروعات ہے یہاں سے یہ پیغام پورے ہندوستان میں جائے گا ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ اس سے اردو کو بھی فروغ ملے گا اور روزگار کے مواقع بھی میسر ہوں گے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

کرناٹک کے ہائی اسکولوں میں اردو بطور تیسری زبان پڑھائی جاسکتی ہے

مسلم منیجمنٹ کے تحت چل رہے اسکولوں میں اس کا نفاذ اردو زبان کے فروغ کا موثر ذریعہ ہوگا

بنگلور۔ عرصہ دراز سے ہائی اسکولوں میں اردو بہ حیثیت تیسری زبان (تھرڈ لنگویج) پڑھائی نہیں جارہی تھی، اصل وجہ یہ تھی کہ ایس ایس ایل سی بورڈ نے بھی اس کی وضاحت نہیں کی کہ اردو بہ حیثیت تھرڈ لنگویج لی جاسکتی ہے اور نہ ہی محکمۂ تعلیم نے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات کی۔ ہمارے بچے مجبوراً ہندی تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھتے ہیں جب کہ قانون ایسا ہے کہ اگر بچے کنڑا یا انگلش پہلی زبان اور انگلش یا کنڑا دوسری زبان (سیکنڈ لنگویج) کی حیثیت سے پڑھیں تو تیسری زبان کی حیثیت سے حسب ذیل میں سے کوئی ایک زبان پانچویں جماعت سے ایس ایس ایل سی تک پڑھ سکتے ہیں: (۱) تمل (۲) تیلگو (۳) ملیالم (۴) مراٹھی (۵) ہندی (۶) اردو (۷) سنسکرت (۸) عربی (۹) فارسی؛ لیکن تمام اسکولوں میں یہاں تک کہ مسلم منیجمنٹ اسکولوں میں بھی تیسری زبان ہندی پڑھائی جاتی رہی ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس سے متعلق معلومات کا فقدان تھا۔ اس سلسلے میں جناب ایس اقبال احمد (اعزازی سکریٹری آئی پی ایم انگلش اسکول بنگار پیٹ) نے محکمۂ تعلیم اور حکومت سے خط و کتابت کی تو ابتدا میں انھیں حتمی جوابات نہیں ملے لیکن جب انھوں نے آر ٹی آئی کا سہارا لیا تو ایک ایک بات کی وضاحت ہوتی گئی۔ اردو کو تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھانے کے سلسلے میں بیس سال قبل ہی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن (ڈی پی آئی) نے ایک حکم نامہ No Ed28. PGC. 94 Bangalore dated 20.04.1994 جاری کیا تھا جس میں اردو زبان کو پہلی، دوسری اور تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھنے کا بچوں کو حق دیا گیا ہے لیکن انگلش میڈیم اسکول منیجمنٹ، یہاں تک کہ مسلم منیجمنٹ بھی اردو کو بہ حیثیت تیسری زبان پڑھانے سے انکار اس لیے کرتے رہے کہ اس سلسلے میں واضح ہدایات حاصل کرنے کی انھوں نے کوشش نہیں کی تھی۔ کئی اسکولوں میں اگر اردو کو فرسٹ لنگویج کی حیثیت سے بچے لیں تو وہ دوسری لنگویج انگلش اور تیسری لنگویج کنڑا لیتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر کنڑا انھوں نے تھرڈ لنگویج کے طور پر لی ہو اور اگر انھیں سرکاری ملازمت ملے تو انھیں علاحدہ سے ایک کنڑا امتحان دینا پڑے گا جو کافی مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بجائے اگر تھرڈ لنگویج اردو لیں، فرسٹ لنگویج انگریزی اور سیکنڈ لنگویج کنڑا پڑھیں تو انھیں کنڑا کا امتحان دینے کی ضرورت نہیں ہوگی، یہ حکومت کا قانون ہے۔ اس اعتبار سے جن اسکولوں میں اردو فرسٹ لنگویج نہیں ہے وہاں سب سے بہتر یہ ہے کہ انگریزی فرسٹ لنگویج پڑھائی جائے۔ دوسری لنگویج کنڑا پڑھائیں اور تیسری لنگویج اردو اختیار کریں۔ اس طرح ہماری مادری زبان بھی زندہ رہے گی اور بچے کنڑا بھی اچھی طرح سیکھ لیں گے اور ملازمت کے لیے اضافی امتحان سے بھی بچ جائیں گے اور ان کی بہ حیثیت فرسٹ لنگویج انگریزی بھی سودمند ثابت ہوگی۔ اردو تھرڈ لنگویج کی حیثیت سے گزشتہ تین برسوں سے پڑھائی جارہی ہے۔ ابھی ختم ہونے والے ایس ایس ایل سی امتحانات میں بچوں نے تیسری زبان کی حیثیت سے اردو کا پرچہ دیا ہے (آئی پی ایم اسکول میں گزشتہ تین برسوں سے اردو بہ حیثیت تھرڈ لنگویج پڑھائی گئی ہے اور اس مرتبہ بچوں نے امتحان بھی دیا)۔ حکومت کی جانب سے آٹھویں، نویں اور دسویں جماعت کی کتابیں بھی اس وقت دستیاب ہیں۔

(سالار، بنگلور)

اردو اساتذہ کا کانٹریکٹ ختم ہونے سے

دہلی کے اسکولوں میں اردو کا سیکشن بند ہوگیا

نئی دہلی (۱۲ اپریل)۔ گزشتہ تعلیمی سال میں اسکولوں میں اردو کا جو حشر ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ اس سلسلے میں حکومت اور محکمۂ تعلیم بھی جان بوجھ کر انجان بنے ہوئے ہیں۔ پورے سال کئی اسکولوں میں اردو کی پڑھائی کا سلسلہ بند رہا ہے جس کی وجہ سے طلبا اردو پڑھنے سے محروم رہے۔ سروشکشا ابھیان کے تحت گزشتہ سال صرف 150 اسکولوں میں محض 150 اردو ٹیچر کا تقرر ہو پایا تھا، لیکن ان اساتذہ کا کانٹریکٹ 31 مارچ کو ختم ہونے کے بعد سے ان اسکولوں میں اردو سیکشن بند ہوگیا ہے۔ سماجی کارکنوں نے والدین سے اپیل کی ہے کہ وہ بچوں کا داخلہ کراتے وقت فارم میں اردو ضرور لکھیں۔

گزشتہ سال حکومت نے اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے بڑے پیمانے پر شروعات کی، مگر کہیں ٹی ای ٹی، کہیں افسر شاہی اور کہیں اسکول انتظامیہ اس میں حائل نظر آیا۔ حکومت نے اردو اساتذہ کی تقرری میں آرہی رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش تو کی مگر اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ اب سب سے بڑا مسئلہ اردو پڑھنے والے طلبہ کا ہے جو یا تو سنسکرت پڑھنے پر مجبور ہیں یا پھر اردو ٹیچر کا انتظار کررہے ہیں۔

گزشتہ برس 53 میں سے 52 اسکولوں میں اردو سیکشن کھولا گیا تھا مگر اس سال ان اسکولوں میں اردو کی پڑھائی شروع تک نہیں ہوئی۔ محکمۂ تعلیم نے بھی اس جانب کوئی توجہ نہیں دی، اگر اردو اساتذہ کی تقرری میں ٹی ای ٹی یا دوسری شرائط حائل تھیں تو وقتی پر اردو اساتذہ کا انتظام کیا جانا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا۔

واضح ہو کہ گزشتہ تعلیمی سال میں سروشکشا ابھیان کے تحت محض 50 اسکولوں میں 50 اردو اساتذہ کی تقرری کی گئی، حالاں کہ حکومت نے 200 اردو اساتذہ کی تقرری کا اعلان کیا تھا، مگر ٹی ای ٹی کی لازمی شرط کی وجہ سے کئی اساتذہ اس میں کوالیفائی نہیں کرپائے۔ ان 50 اساتذہ کا کانٹریکٹ 31 مارچ کو ختم ہوگیا جس کی وجہ سے ان اسکولوں میں اردو کا سیکشن بند کردیا گیا ہے، حالاں کہ ہر سال ان اساتذہ کا کانٹریکٹ 10 مئی تک بڑھادیا جاتا تھا مگر اس سال ایسا نہیں کیا گیا۔

سماجی کارکن ابن اللہ خان، قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے کوآرڈی نیٹرز چودھری عباس علی، منظور علی خان اور شہادت علی نظامی نے مشترکہ طور پر کہا کہ محکمۂ تعلیم کو ان اساتذہ کا کانٹریکٹ بڑھانا چاہیے تاکہ جہاں اردو پڑھائی جاری ہے وہاں یہ سلسلہ جاری رہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ والدین اپنے بچوں کا جب داخلہ کرانے اسکول جائیں تو وہاں فارم میں ہندی، انگریزی کے علاوہ تیسری زبان کے طور پر اردو کا انتخاب ضرور کریں چاہے وہاں ٹیچر مہیا ہو یا نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب اسکولوں میں اچھی تعداد میں اردو پڑھنے والے بچے ہوں گے تو اسکول انتظامیہ بھی اردو ٹیچر مہیا کرانے پر مجبور ہوگا اور یہ بات حکومت کے جاری سرکلر میں بھی موجود ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ گزشتہ سال حکومت نے اردو اساتذہ کی تقرری پر بیحد ہاتھ دکھائے، حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ ٹی ای ٹی کی شرط کو ہٹا دیا جائے گا مگر وزارت فروغ انسانی وسائل نے یہ شرط ہٹانے سے صاف انکار کردیا تھا۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو میڈیم اسکولوں سے 'نان اردو اسٹاف' کو فوراً ہٹایا جائے

نئی دہلی (۳۰ اپریل)۔ انجمن اردو دوست کانفرنس نے دہلی کے سرکاری اردو میڈیم اسکولوں میں اردو سے ناواقف پرنسپل اور اساتذہ کی تقرری پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لفٹننٹ گورنر نجیب جنگ سے مطالبہ کیا ہے کہ اردو سے ناواقف پرنسپل اور اساتذہ کو اردو میڈیم اسکولوں سے ہٹایا جائے۔ کانفرنس کے کنوینر کا کہنا ہے کہ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ سرکار کی جانب سے اردو میں درسی کتابوں کی اشاعت کی گئی ہے چوں کہ ان اسکولوں میں کوئی سپروائزری اسٹاف یا اردو سے واقف ایجوکیشن ڈپٹی ڈائرکٹر اور ایجوکیشن آفیسر نہیں ہیں اس لیے ان درسی کتابوں کو اردو میڈیم طلبہ وطالبات تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔ ان کا الزام ہے کہ دہلی کے تمام اردو میڈیم اسکولوں میں ایسے پرنسپل، وائس پرنسپل اور ٹیچروں کی تقرری کی گئی ہے جو اردو سے نابلد ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ اردو کی درسی کتابیں اردو میڈیم اسکولوں میں دستیاب کرائی جائیں۔

ذرائع کا کہنا ہے کہ سرکار کی جانب سے دریا گنج میں منعقد اسکول انتظامیہ کمیٹی (SMC) کی دو روزہ میٹنگ میں اردو میڈیم اسکول کی کسی بھی پرنسپل نے ایس ایم سی کے اردو کتابچے کا مطالبہ نہیں کیا جب کہ میٹنگ میں اس بات کی نشان دہی کی گئی تھی کہ ایس ایم سی کے کتابچے کو اردو میں بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جب اردو میڈیم اسکولوں کے پرنسپل ہی مانگ نہیں کریں گے تو پھر اردو کی درسی کتابوں کی رسائی اردو کے طلبہ و طالبات تک کیسے ہوگی۔ کئی طلبہ کے والدین کا یہ الزام ہے کہ بچوں کی اردو میں کمی کی شکایتوں کی درخواستوں کو اسکولوں میں ردی کی جانے لگا ہے۔ ان اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے والدین کا یہ بھی کہنا ہے کہ مذکورہ اسکولوں کے معیار کو بلند کرنے کی بجائے اس کے معیار کو مسلسل گرایا جارہا ہے اور ان اسکولوں کا اردو میڈیم ختم کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : تذکرہ ہم نفساں
(علاقہ بہار کے ہم عصر قلم کاروں پر مضامین)
مصنف : ڈاکٹر محبوب راہی
ضخامت : ۲۵۶ صفحات
قیمت : ۲۵۰ روپے
ملنے کا پتا : ڈاکٹر محبوب راہی، بارسی ٹاکلی، ضلع اکولہ، مہاراشٹر
تبصرہ نگار : حبیب الرحمٰن ندوی
muftihabib0786@gmail.com

ڈاکٹر محبوب راہی کی مطبوعات کی تعداد کے اعتبار سے یہ اکتالیسویں کتاب ہے۔ چالیسویں نمبر کی ان کی بچوں کی نظموں کے مجموعے 'رنگا رنگ پھلواری' پر رسائل و جرائد میں تبصروں کا سلسلہ شروع ہے کہ حسب روایت موصوف اپنی ایک اور کتاب لے کر محفل ادب میں آن دھمکے ہیں۔ اس کتاب میں مشمولہ مضامین کی فہرست پر سرسری نظر ڈالتے ہی راہی صاحب کی کشادہ قلبی اور وسیع المشربی کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ علاقہ بہار کے تقریباً ہر قابل ذکر اور ناقابل ذکر شاعر اور نثر نگار کے فن پر موصوف نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ مثبت انداز میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ 43 مضامین کی فہرست میں 37 مضامین مختلف ادبی شخصیات کی کتابوں پر بہ طور پیش لفظ یا مختصر تبصروں کی شکل میں راہی صاحب نے مختلف اوقات میں تحریر کیے ہیں جو ملک کے بیشتر ادبی اخبارات و رسائل میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ اکولہ کے ادبی افق پر نئے قلم کاروں کی جگمگاتی کہکشاں یہ کتاب کا سب سے طویل تر مضمون ہے، جس میں شہر کے حقہ مین اور متوسطین قلم کاروں کے سرسری تذکرے کے ساتھ 18 تازہ واردان بساط نو کے فن پر سرسری روشنی ڈالی گئی ہے جن سے اکولہ کا روشن ادبی مستقبل وابستہ ہے۔ باقیہ میں چند مرحومین کے سوا بیشتر راہی صاحب کے ہم عصر قلم کاروں پر مضامین ہیں۔ اس سے قبل بہار کے چند نامور قلم کاروں مثلاً مردان علی خاں نشاط، رفیق احمد، خلیل فرحت، ان مرحومین کے علاوہ راز بالاپوری، ڈاکٹر غیاث الرحمن، انوار قمر، حیدر بیابانی، اقبال خلش، ضیا رحمی، لطیف سبحانی، احمد امام، امان الحق، نعیم فراز، تسلیم فرحت اور عظیم وقار وغیرہ پر تحریر کردہ راہی صاحب کے مضامین ان کی اس سے قبل اشاعت پذیر کتابوں میں شامل کیے جا چکے ہیں، جس کا ذکر موصوف اس کتاب میں کر چکے ہیں۔ کتاب کے آخر میں ۳ مضامین اور ۲ مرثیے راہی صاحب نے اپنے احباب کے انتقال پر نہایت اثر انگیز انداز میں تعزیتی مضامین کی شکل میں لکھے ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے، جن میں عبداللطیف خاں، ہدایت اللہ خاں، رفیق شاکر اور ڈاکٹر امین بیدوودی ان مرحومین کے نام راہی صاحب نے اپنی کتاب کا انتساب کر کے اس کی اثر انگیزی میں اضافہ کیا ہے۔

کتاب میں مشمولہ تمام مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد جہاں علاقہ بہار کی علمی، ادبی، تخلیقی اور تصنیفی سرگرمیوں کا ایک جگمگاتا ہوا منظر نامہ سامنے آ جاتا ہے وہیں حتمی طور پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اس چھوٹے سے علاقے میں بہ یک وقت اتنے سارے اہم قلم کاروں کی موجودگی، جہاں اس علاقے کے اعلا وارفع علمی و ادبی وقار و اعتبار کے ثبوت فراہم کرتی ہے وہیں دوسرے علاقوں کے لیے باعث تقلید بھی کہی جا سکتی ہے۔ ایک افادی پہلو اس کتاب کا یہ بھی ہے کہ اس علاقے کے ادب پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک اہم ماخذ ثابت ہو سکتی ہے

•••

نام کتاب : شعاع نوا (مجموعہ نعت)
مصنف : رئیس احمد نعمانی
ضخامت : ۱۹۱ صفحات
ہدیہ : ۱۵۰ روپے
ناشر : گوشۂ مطالعات فارسی علی گڑھ
تبصرہ نگار : امیر حمزہ
ameerhamzah033@gmail.com

نعت اردو ادب کی ایک مقدس صنف فن ہے اور دوسری مذہبی شاعری کی طرح اس کا منبع و مصدر بھی قرآن و حدیث ہے۔ نعتیہ شاعری کے بیشتر مضامین قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ سے مستفاد اور ماخوذ ہوتے ہیں۔ وہ معدودے چند نعت گو شعرا جنھیں علوم شرعیہ پر کامل عبور تھا، انھوں نے اپنے کمال علم و تقوی کی برکت سے نعت کی شمشیر آبدار پر مکمل حزم و احتیاط سے قدم رکھا اور وادی عشق کو عافیت و سلامتی کے ساتھ عبور کرنے میں کامیاب رہے ہیں، ان میں سے ایک رئیس احمد نعمانی بھی ہیں۔

رئیس احمد نعمانی کی شاعری کی ابتدا ہی نعت گوئی سے ہوئی ہے ان کے اب تک چھ نعتیہ مجموعے 'چراغ نوا'، 'گلہائے نعت'، 'السلام اے سبز گنبد کے مکیں'، 'فروغ نوا'، 'گل بانگ نعت' اور 'شعاع نوا' شائع ہو چکے ہیں اور اس صنف کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کر چکے ہیں۔

'شعاع نوا' رئیس احمد نعمانی کا تازہ نعتیہ مجموعہ ہے، جس میں انھوں نے ایک مقدمہ 'حرف ناگزیر' کے عنوان سے لکھا ہے اس مقدمہ میں انھوں نے اس بات کی جانب خصوصی توجہ دی ہے کہ اکثر لوگ نعت میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں یہاں تک کہ عابد و معبود میں فرق قائم نہیں کر پاتے ہیں۔ جیسا کہ مصنف خود لکھتے ہیں کہ نعتیہ شاعری کے میدان میں اکثر بڑے بڑے شعرا بھی، شعوری یا غیر شعوری طور پر، فکری کج روی یا غیر محتاط بازی گری کی تم ظریفی کے معمول بنے ہوئے ہیں۔ رئیس احمد نعمانی اس معاملے میں بہت ہی محتاط رہے ہیں۔ جیسا کہ ان کے کلام سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے:

ادب، ادب امر بی قریحتی طراز کہ ہے
سکوت، بزم وفا میں، ہزار کی بات
زمانے کو دیا درس، احترام آدمیت کا
وگرنہ دہر میں ارزاں تھا انسان کا لہو کیا کیا
نہ غرور کی چال چلی، نہ جنوں کی کج کلاہی
مرے دل کی سلطنت میں ہے انھیں کی بادشاہی

ان اشعار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رئیس احمد نعمانی کتنا احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ انھوں نے نعت گوئی کو صرف ایک فن کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا ہے بلکہ نعتیہ شاعری کے کچھ ایسے نمونے پیش کر کے دنیا کے علمی و ادبی میراث میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ جن کو پڑھ کر موجودہ اور آئندہ تمام نعت گو شعرا کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ بے لگام تخیلات اور مضوعات شرعیہ سے مجتنب رہ کر بھی نعت کہی جا سکتی ہے اور جس کو پڑھ کر یا سن کر سرور عالم کی ذات پاک سے ذہنی وابستگی مستحکم تر ہو جائے۔ اس مجموعے میں عاشق و معشوق جیسے الفاظ اور آپ کی شان کی مناسبت سے 'تو' اور 'تیرا' اقسم کے الفاظ سے بھی پرہیز کیا گیا ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت جو اس مجموعۂ کلام کی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے خالق و مخلوق کے فرق کو بالالتزام ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے۔

کتاب کو حمد سے شروع کیا گیا ہے، جس میں تین حمد ہیں۔ اس کے بعد نعت نبی کو ردیف کی ترتیب میں شامل کیا گیا ہے اس کے بعد ایک قصیدہ شامل ہے۔ آخر میں سلام کے تحت وہ ایسے سلام شامل کیے گئے ہیں جو کئی مرتبہ روضۂ اطہر میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ اس کتاب میں بہت ہی دل چسپ اور معلوماتی حواشی تحریر کیا گیا ہے جو تقریباً ۱۹۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب کئی خصوصیات کی حامل ہے۔

•••

بقیہ: اردو ادب اور قومی یک جہتی

صفحہ ۲ سے آگے

سے تعلق رکھتے ہیں:

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

ان خیالات کو ایک صوفی بھی قبول کر سکتا ہے اور ویدانت کا عامل بھی۔

صوفی کہتے ہیں فنا بقا کا دیباچہ ہے اس لیے نیستی ان کا عین مقصود اور منتہائے آرزو ہے۔ یہ تصوف موت سے آنکھیں ملا سکتا ہے اور وہ بھی ترقی کی ایک منزل ہے:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

صدر صاحب! میں آپ کی اجازت سے ایک بزرگ کا قول نقل کرنا چاہتا ہوں:

"تہذیب یا کلچر کا ایک ظاہری پہلو ہے ایک باطنی۔ جب آپ کسی شخص کو مہذب یا تہذیب یافتہ کہتے ہیں تو آپ اس کے ظاہر و باطن دونوں کی شائستگی کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہی صورت قومی تہذیب کی ہے۔ اس کے باطنی حصے میں وہ تمام مادی، اخلاقی اور جمالیاتی قدریں، وہ تمام عقیدے، امنگیں، تجربے، خواب، آدرش شامل ہوتے ہیں جنھیں قوم یا اس کا بااختیار طبقہ اختیار کرتا ہے۔ یہ باطنی کیفیتیں تہذیب کی ظاہری صورت میں دو طرح نمایاں ہوتی ہیں اول اس بکھری ہوئی نا تراشیدہ صورت میں جسے ہم کسی معاشرے کا Way of Life رہن سہن یا زندگی کا روز مرہ کہتے ہیں۔ دوم اس منجھی ہوئی، ترشی ہوئی، ڈھلی ہوئی صورت میں جو حسن اور فن کے ذخائر اور تخلیق میں منتقل ہوتی ہے"۔

عہد وسطی کی تہذیب میں ظاہر، باطن، یہ دونوں پہلو مشترک قدروں، اتحاد پسندی اور مفاہمانہ روش سے متاثر ہیں۔ اگر یہ اتحاد اور اتفاق نہ ہوتا تو ہمارا لٹریچر جو زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے کبھی بھی دلوں کو متاثر نہ کرتا۔ پدماوت کا مصنف ہندو بھی ہو سکتا تھا اور 'گلزار نسیم' ایک مسلمان کی بھی تخلیق ہو سکتی تھی۔ ہندو اور مسلمان مصنفین کی لفظیات، تشبیہات اور انداز فکر سب ایک ہیں۔ دونوں اپنے لیے لب گور اور اپنے دشمن کے لیے واصل جہنم شد لکھتے ہیں۔ ٹھیٹ ہندوستانی الفاظ کی ہمہ گیری کے اثر سے مذہبی شاعری بھی خالی نہیں ہے۔ مشہور نعت گو مولانا محسن کاکوروی کے نعتیہ قصیدے کی تشبیب اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیوں کر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بے کل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

اردو پر ایک اعتراض یہ ہے کہ اس کے سارے خط و خال ایرانی ہیں۔ اس کے باغ سرو و صنوبر سے اور اس کی بہار لالہ و گل سے عبارت ہے۔ اس کی تلمیحات میں شیریں و فرہاد ہیں یا رستم و سہراب، لیکن یار ما ایں دارد و آں نیز ہم۔ جس طرح ہماری موسیقی اور مصوری، ہماری عمارتوں اور ہماری صوفیانہ تحریکوں کو خالص اسلامی کہنا غلط ہوگا۔ اسی طرح ہندی شاعری کی شاید ہی کوئی تشبیہ ایسی مل سکے جسے اردو شعرا نے استعمال نہ کیا ہو۔ انھوں نے زلف کی تشبیہ جمنا کی موج سے، دانت کی ہیرے کی کنی سے،

زلف کی سیاہی کی تشبیہ بھونرے سے اور پاے نگارین کی تشبیہ کنول سے دی ہے۔ محبوب کی مانگ کا سیندور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابر سیاہ سے دھنک نمودار ہو۔ مرزا شوق کا کیا اچھا شعر ہے

آنکھیں، بھونروں کی طرح کالی
قد، لوچ میں ناروں کی ڈالی

اردو کے ذخیرے میں بہ قول مولف 'فرہنگ آصفیہ' پانچ لاکھ چالیس ہزار الفاظ ہیں، ان میں ۸۰ فیصد سنسکرت الاصل ہیں۔ اس کے بیشتر مصادر، افعال، ضمائر اور حروف، سابقے، لاحقے، اعداد و شمار ہندی الاصل ہیں باقی ۲۰ فیصد الفاظ عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، پرتگالی وغیرہ سے آئے ہیں۔ اسما و صفات، عربی اور فارسی کے زیادہ ہیں جو بالکل قدرتی بات ہے، اس لیے کہ ترک اور مغل بہت سی چیزیں اپنے ساتھ ہندستان میں لائے جن سے اس ملک کی رونق بڑھی، ان کے وہی نام قائم ہیں جیسا کہ آج بہت سے یورپی لفظ رائج ہوگئے ہیں مثلاً کالج، یونیورسٹی، پارلیمنٹ، ریڈیو، ٹیلی وژن، تھرمامیٹر، بلڈ پریشر۔

اردو زبان کے معاملے میں تفریق نہیں کرتی۔ وہ فلاں ابن فلاں کی قائل نہیں ہے۔ جو لفظ اس میں کھپ جاتا ہے وہ قبول کرلیا جاتا ہے اور رائج ہوجاتا ہے۔ اس طرح اس کے دامن میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ خزینہ دار بن جاتی ہے مثال کے طور پر کھانے کا سادہ طریقہ تو یہ ہے کہ چولھے کے پاس بیٹھ کے کھانا کھالیا جائے لیکن اردو کے دسترخوان کی تفصیلات اور اس کے تکلفات مزے سے خالی نہیں ہیں مثلاً فرش، دسترخوان، سینی، کشتی، خوان پوش، پیالہ، پیالی، بادیہ، رکابی، طشتری، قاب چمچے، نمک دان، سینی، آفتابہ، تسلہ، رومال، صراحی، آب خورہ، شربت، برفاب، زعفران حلوا، حلوائی، رکاب دار، خاصہ، باورچی! یہ سب لفظ باہر سے آئے ہیں لیکن ان سے اردو زیادہ شائستہ، زیادہ وسیع، زیادہ مہذب ہوگئی۔ یہی صورت ان یورپی الفاظ کی ہے جو اب سائنسی اور تحقیقی انقلابات کی وجہ سے رائج ہوگئے ہیں۔

اردو نے فارسی سے استفادہ کیا ہے لیکن اس کی رگوں میں ہندستانی خون ہے۔ اس کا ادب ہندستانی تہذیب کی رنگا رنگ فضا میں پروان چڑھا ہے۔ اس کے مشاعرے، بعض اوزان و بحور، اس کی سراپا نگاری، اس کی بیانیہ نظمیں، اس کے بارہ ماسے، اس میں محبت کی تفصیلات، بیان فراق یا ہجر و وصل، اس کی بعض صوفی اصطلاحیں، بعض اوراد و وظائف، ذوق و شوق کے کلمات، پیا اور ساجن، رسم و رواج، وضع قطع، لباس، آرائش، گھر کی فضا، غرض اس کی زمین، اس کا آسمان یکسر ہندی الاصل ہیں۔

آخر میں اس بات کے دہرانے میں مضائقہ نہیں کہ اردو کو ہندستانی زبانوں میں جو اہمیت حاصل ہے وہ اتفاقی نہیں ہے بلکہ صدہا سال کی ترقی ضروریات اور تحریکات کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس نے ہماری تہذیب کو سنوارا ہے، اس میں طرح داری اور وسعت پیدا کی ہے۔ آزادی کے گیت گائے ہیں۔ اس نے کاٹا نہیں، جوڑا ہے، انقلاب اور عشق و محبت کے نغمے گائے ہیں اور اپنی شوخی تحریر سے ہندستان کے نقش میں بڑے حسین اور دلآویز رنگوں کا اضافہ کیا ہے۔ ہمیں ذہن کے جالے صاف کرکے اور دل کی تنگی کو چھوڑ کر اردو کی خدمت کے لیے کمربستہ ہوجانا چاہیے۔ آزادی نے آپ کے سامنے بے شمار امکانات اور وسیع مواقع پیش کردیے ہیں۔ اس سے پہلے آپ کے پاس یہ ایوان غالب کہاں تھا، یہ ترقی اردو بورڈ کہاں تھا، یہ قومی آواز کہاں تھا؟ اردو کی خدمت ہندستانی تہذیب کی خدمت ہے۔ ہندستان کی سالمیت کی خدمت ہے۔ سیکولر اور جمہوری سماج کی خدمت ہے۔ اردو کی خدمت زندگی کی اعلا اور انسانی قدروں کی خدمت ہے۔ اگر اردو کے کارناموں کی پرچھائیاں ہمیں نئے تمدن میں، نئے ہندستان میں جو زیر تعمیر ہے، حرکت کرتی ہوئی معلوم نہ ہوں تو اس سے نہ صرف اردو کو نقصان پہنچے گا بلکہ پورے ملک کو، اس کی گنگا جمنی تہذیب کو اور اس کے جمہوری نظام کو نقصان پہنچے گا۔ جمہوری نظام کو فرشتے نہیں چلاتے، مشینیں نہیں چلاتیں، انسان چلاتے ہیں، ہم اور آپ چلاتے ہیں۔ ہمیں بہ قول جاپانیوں کے ایسے بیج بونا ہیں جو نیا ذہن رکھتے ہوں اور تہذیب کی اعلا اقدار سے محروم نہ ہوں، اس وقت اصلی کام نئے ہندستان کی تعمیر کا اور ایک بہتر سماج کی تشکیل کا ہے۔ سماج کی تشکیل علاء الدین کے چراغ سے نہیں ہوسکتی، یہ ہائی جمپ نہیں ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ افراد کی تعلیم و تربیت میں محنت اور ریاضت کی جائے۔ ایڑی چوٹی کا پسینہ بہایا جائے۔ یہ کام اردو بہ حیثیت مادری زبان کے بہ خوبی انجام دے سکتی ہے اس لیے کہ وہ اپنی فراخ دلی، شگفتگی فکر، ملنساری، عوام دوستی، دلکشی، جگرداری اور عالی حوصلگی سے ہمارے اندر وہ صفات پیدا کرتی ہے جس کے ذریعے ہم مستقبل کی ذمے داریوں کو پورے اعتماد کے ساتھ اٹھا سکتے ہیں۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (اور ہمارے ذمے تو صاف صاف پہنچا دینا ہے اور بس)۔ شکریہ!

(غالب نامہ، دہلی، جنوری 1986)

■◆■

بقیہ: علامہ اقبال کا تصور تقدیر

صفحہ ۳ سے آگے

اہلیت پیدا کیجیے۔ تقدیرات بہتر سے بہتر موجود ہیں، لہٰذا بہتر سے بہتر کی طرف بڑھتے جایئے اور تبدیلی تقدیر کے باب میں اللہ کے حضور دعا گو رہ کر توفیق طلب کرتے رہیے۔ "خودی کا نصب العین یہ نہیں کہ کچھ دیکھے بلکہ یہ کہ کچھ بن جائے۔"

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

حواشی:

۱ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۱۶۵۔
۲ بال جبریل، ص ۳۳/۳۲۵، ص ۱۳۲/۳۴۴
۳ ایضاً، ص ۲۸/۳۲۰
۴ قرآن کریم، سورہ ۵۵، آیت ۲۹
۵ قرآن کریم، سورہ ۳۵، آیت ۱
۶ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۷۶
۷ بال جبریل، ص ۹۳/۳۸۵
۸ ایضاً، ص ۲۸/۳۲۰
۹ ایضاً، ص ۱۲۸/۳۲۰
۱۰ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۱۲۷
۱۱ ایضاً، ص ۸۲
۱۲ بال جبریل، ص ۱۴۹/۳۴۱
۱۳ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۸۳
۱۴ ایضاً، ص ۷۸
۱۵ قرآن کریم، سورہ ۵۳، آیت ۳۸
۱۶ ایضاً، سورہ ۱۹، آیت ۹۵
۱۷ بال جبریل، ص ۱۳۰/۳۲۲، ۱۴۹/۳۴۱
۱۸ اصل انگریزی عبارت یہ ہے:
"...And what is the kind of conduct that befits the place we occupy."
۱۹ ارمغان حجاز، ص ۳۳/۹۵۵
۲۰ ضرب کلیم، ص ۸۲/۵۳۸
۲۱ آخری جملے کے اصل الفاظ یہ ہیں اور وہ اوپر درج کردہ شعر کے مفہوم سے زیادہ قریب ہیں۔ ترجمہ قدرے بنا ہوا معلوم ہوتا ہے:
"It is one of the most essential teachings of the Quran that nations are collectively judged and suffer for their misdeeds here and now."
۲۲ ارمغان حجاز، ص ۱۳۶/۱۰۲۸
۲۳ قرآن کریم، سورہ ۵۳، آیت ۳۹
۲۴ اسرار و رموز، ص ۱۶۵/۱۶۵
۲۵ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۱۹۷
۲۶ قرآن کریم، سورہ ۱۳، آیت ۱۱
۲۷ تہذیب الاخلاق، دار مکتبۃ الحیاۃ، بیروت، ص ۱۶
۲۸ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۱۲۹
۲۹ ضرب کلیم، ص ۲۳/۵۲۹
۳۰ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۱۳۸
۳۱ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۸۳
اور اصل انگریزی کے الفاظ یہ ہیں:
"We become by ceasing to be what we are. Life is a passage through a series of deaths."
۳۲ اسرار و رموز، ص ۵۳،۵۵/۵۳،۵۵
۳۳ بال جبریل، ص ۱۵۶/۳۴۸، ۱۵۷/۳۴۹
۳۴ جاوید نامہ، ص ۱۰۷/۹۹۵، ۱۰۸/۹۹۶
۳۵ ضرب کلیم، ص ۷۸/۵۳۰
۳۶ بال جبریل، ص ۳۳/۳۲۵
۳۷ ضرب کلیم، ص ۳۷/۴۹۹
۳۸ ایضاً، ص ۱۵/۴۷۷
۳۹ عوارف المعارف از عبدالقادر بن عبداللہ سہروردی، دارالکتاب عربی، بیروت، ص ۴۵۳
۴۰ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۱۹۱
۴۱ قرآن کریم، سورہ ۷، آیت ۱۷۲
۴۲ الانسان فی القرآن از محمود العقاد، ص ۹۵
۴۳ بال جبریل، ص ۷۵/۳۶۷
۴۴ ضرب کلیم، ص ۶۸۷/۱۹۵، ۳۲۸/۲۹۶
۴۵ جاوید نامہ، ص ۱۰۷/۹۹۵
۴۶ قرآن کریم، سورہ ۲۵، آیت ۲
۴۷ تہذیب الاخلاق، دار مکتبۃ الحیاۃ، بیروت، ص ۱۶
۴۸ قرآن کریم، سورہ ۳۶، آیت ۳۹
۴۹ قرآن کریم، سورہ ۲۵، آیت ۲
۵۰ جاوید نامہ، ص ۱۰۷/۹۹۵
۵۱ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۲۰۹
۵۲ ارمغان حجاز (اردو)، ص ۳۲/۹۸۳

(انتخاب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور 1984)

☆☆☆

زبیر شفائی

ایک آواز جو گم ہوگئی ویرانے میں

ضیاء فاروقی (ایم۔ایچ۔کے۔آئی۔ٹی، رفیقیہ اسکول روڈ، بھوپال)
E-mail: ziafarooqui@ymail.com

اردو کے سنجیدہ شعر و ادب میں وہ مقام جہاں سے شب خون کی علم برداری شروع ہوتی ہے وہیں تازہ دم شاعروں کا وہ کارواں بھی نظر آتا ہے جس کے پاس ماضی کی صحت مند اقدار، حال کا بہ جہت عرفان اور مستقبل کا تابناک تصور بھی کچھ تھا۔ یہ کارواں جس میں منیر نیازی، خلیل الرحمن اعظمی، بشی چندربانی، زیب غوری، ظفر اقبال اور شہریار جیسے شعرا ہراول دستے کے طور پر پیش پیش تھے نہ صرف یہ کہ توانا اور تحریک فکری اساس سے مالا مال تھا بلکہ غزل کی خوابیت اور کلاسکیت کا امین بھی تھا۔ یہاں وہ پیکر پرست شعرا بھی نظر آتے ہیں جو ادب میں جمود اور یکسانیت کا شکار ہو رہے تھے۔ ان شعرا نے بھی اس کاروانِ سخن میں نہ صرف شمولیت اختیار کی بلکہ شمع غزل کی لو کو باد مخالف سے بچانے میں اپنی انگلیاں بھی فگار کیں۔ پیکر پرست شعرا کی اس صف میں ایک نام زبیر شفائی کا بھی آتا ہے جنھوں نے دانستہ طور پر جدیدیت کی ترجمانی کرتے ہوئے تبدیل شدہ شعری رویوں کو نہ صرف قبول کیا بلکہ غزل کے اس سفر میں نئی سمتوں اور جہتوں کی بازیافت بھی کی۔

زبیر شفائی کے شعری سروکار پر گفتگو سے پہلے ہمیں اس ماحول پر بھی نظر ڈالنا ہوگی جہاں ان کی فکرِ سخن پروان چڑھی۔ وہ کانپور میں پیدا ہوئے اور یہیں زندگی کی لگ بھگ چھپن بہاریں دیکھ کر ۲۷ فروری ۲۰۰۸ کو آخری سفر پر روانہ ہوگئے۔ دیکھا جائے تو بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تک کانپور کے شعری منظرنامے میں جہاں چند لوگ ترقی پسند تحریک کے باقیات کی نمائش کر رہے تھے وہیں روایتی اقدار کی پاسداری کرنے والے شعرا کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ زبیر شفائی جب اس میدان میں آئے تو انھوں نے بھی حسرت موہانی، ثاقب کانپوری، نشور واحدی اور فنا نظامی جیسے شعرا سے متاثر ہوکر نہ صرف یہ کہ بیکس کانپوری تخلص اختیار کیا بلکہ مقامی استاد شاعر رشید قمر لکھنوی کے زیر سایہ غیر شعوری طور پر ان راستوں سے گزرے جہاں ہماری روایتی کلاسیکی شاعری مہک رہی تھی۔ بعد میں ۱۹۷۰ء کے آس پاس جب جدیدیت پورے خدوخال کے ساتھ ان کے سامنے آئی تو اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوگئے جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ ڈاکٹر شفا گوالیاری کے شاگرد ہوئے بلکہ بیکس سے زبیر شفائی ہوگئے۔ یہ سب تو ہوا لیکن یہاں بھی انھوں نے تغزل کے ان رنگوں کو نہیں برتا جن کا تعلق ہماری روایتی کلاسیکی شاعری سے ہے اور یہاں بھی ان کا ذہنی فکرانجی راستوں پر گامزن رہا جن پر محبوب کے خدوخال اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔ حالاں کہ اس جدید روش کے سہارے انھوں نے جو شعری پیکر تراشے ان میں آمد کے مقابلے میں آورد کا گمان زیادہ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود لہجے کی بے ساختگی اور شعری پُراثری کہیں مجروح نہیں ہوتی ہے۔ یوں بھی جدید شعری رویوں میں آمد اور آورد کی بحث غیر ضروری ہے کہ آج کی بیشتر شاعری آورد کے زیر اثر ہے اور خوب تر ہے۔ زبیر شفائی کے شعری آہنگ میں نہ صرف لطافت اور اثر آفرینی ہے بلکہ یہاں ادب کی نئی سلطنتوں کے سراغ بھی واضح طور پر ملتے ہیں:

> دھویں کی انگڑائیوں سے ہے مشتعل اجالا
> چراغ کے ہونٹ سے ہوا ہونٹ مل رہی ہے
>
> فرقرائی کرہ کرہ تملائی طاق طاق
> شمع کی لو چومنے کے بعد ہی جھونکا گیا
>
> کل سے زیادہ آج ہوا زوردار ہے
> جلتے ہوئے چراغ کی لو تار تار ہے

مندرجہ بالا اشعار میں چراغ، دھواں اور ہوا کے امتزاج سے جو شعری پیکر تشکیل پاتا ہے وہ اپنے لسیط پس منظر میں ایسا کرب رکھتا ہے جس میں احتجاج بھی ہے اور جھنجھلاہٹ بھی۔ زبیر نے ان روایتی لفظوں کا جس خلاقانہ طریقے سے استعمال کیا ہے اس سے الفاظ کی جدید تفہیم اور نئی معنویت تہ در تہ کھلتی چلی جاتی ہے۔ انھوں نے نسوانی حسن، اس کی نزاکتوں اور لطافتوں کے حوالے سے جو اشعار کہے ہیں وہ اتنے بھرپور اور مکمل ہیں کہ ابہری سطح کے ہونے کے باوجود مرقع نگاری کا بہترین نمونہ کہے جاسکتے ہیں:

> دو سرے پائنک ہے جیسے فوارہ روشنی کا
> تمام اعضا میں اک اک شمع جل رہی ہے
>
> جسم پر تنگ لباس کے نشانات ہوں بس
> رات کے پچھلے پہر اور سنورنا کیسا
>
> تتلی، جگنو، سمندر، خوشبو، دھنک، شرارہ
> اے جان ہم نے دیکھا تجھ کو اگر تو دیکھا
>
> بجلی نہیں کہ چمکتی ہیں یہ پتلیاں اس کی
> نگاہ میں بھی ہے وحشت غزال صحرا کی
>
> نزاکت وہی گداز وہی سرکشی وہی
> پائل ترے بدن کی طرح کو ہسار ہے
>
> پل بھر میں بے شمار بدلتی ہے زاویے
> وہ چشم نیم باز بڑی تازہ کار ہے

زبیر شفائی نے پیکر تراشی کے اس عمل میں جمالیاتی حس کو جس سطح پر برتا ہے اسے ہم لکھنؤ اسکول خصوصاً آتش کے لب و لہجے کی جدید روش بھی کہہ سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار میں حسن مجازی کی بوالعجبیوں کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ یہاں غزل کے ان لغوی معنوں کا احترام بھی ہے جو انھیں محبوب کے خدوخال کی تعریف کرنے پر اکساتا ہے۔ بدن کی جمالیات اور نسوانی حسن کی تعریف و توصیف کے سلسلے میں مجاز، جوش، فراق اور اختر شیرانی وغیرہ نے جو کچھ کہا ہے اسے یقیناً اولیت حاصل رہے گی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان حضرات نے غزل کے مقابلے میں دوسری اصناف سخن میں اس کا واضح اظہار کیا ہے جب کہ زبیر شفائی غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے شعری اکائی میں وہ سب کچھ سمو دیا ہے جس کے لیے دفتر درکار ہوتا ہے۔ اپنے اس پسندیدہ موضوع کے علاوہ بھی زبیر نے جہاں زندگی کے دوسرے مسائل کو شعری قالب میں ڈھالا ہے وہاں بھی اپنے لہجے کے طمطراق اور اپنے مخصوص آہنگ کو برقرار رکھا ہے:

> میں تو اس رات کے بہروپ سے آشنا گیا
> داغ دامن سے ہوا غائب تو دل تک آگیا
>
> زندگی سے زندگی تک میں کہیں تھا ہی نہیں
> صرف مرغولہ ہوا میں جھومتا پایا گیا
>
> سرگرم آفتاب رہے آنکھوں کے لیے خواب
> نیندیں ہی لے گئے رات کے پچھلے پہر آ کے
>
> میں وقت کاٹتا ہوں مجھے کاٹتا ہے وقت
> دونوں کی آن بان مگر برقرار ہے

یا اور اس قبیل کے اشعار ایسے نہیں ہیں جنھیں سرسری طور پر دیکھ کر نظرانداز کر دیا جائے۔ یہاں بیانیہ کی وہ سطح تصور ہوتی ہے جس کی تہ میں میر و غالب کی فکری اساس موجود ہے۔ زبیر شفائی کے اس شگفتہ ہوئے پیرایۂ اظہار میں بیانیہ تشکیل ہی نہیں متاثر کن بھی ہے۔ الفاظ کا دروبست ہو یا لہجے کی انفرادیت ان کے اشعار سامعین کو چونکاتے ہی نہیں ذہن کو سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

> زبیر شفائی کے شعری سروکار پر گفتگو سے پہلے ہمیں اس ماحول پر بھی نظر ڈالنا ہوگی جہاں ان کی فکرِ سخن پروان چڑھی۔ وہ کانپور میں پیدا ہوئے اور یہیں زندگی کی لگ بھگ چھپن بہاریں دیکھ کر ۲۷ فروری ۲۰۰۸ کو آخری سفر پر روانہ ہوگئے۔

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں
مطبوعہ: شمرآفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org

ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ــــ (ادارہ)